قرآن اور حدیث

منکرینِ حدیث کے مسلک پر ایک ناقدانہ نظر

(۳)

منکرینِ حدیث کے مقالات پر نظر کرتے ہوئے، انکارِ حدیث کے دو وجوہ قرار دیے جا سکتے ہیں:

ایک یہ کہ اسلام کے نظامِ دینی میں سرے سے حدیث کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ صرف قرآن کافی ہے۔

دوسرے یہ کہ احادیث ناقابلِ اعتبار ہیں۔

ان میں سے پہلی وجہ کا جواب پہلے دیا جا چکا ہے۔ رہی دوسری وجہ، تو اس کی غلطی بھی اشارۃً گذشتہ صحبت میں ظاہر کی جا چکی ہے، لیکن ضرورت ہے کہ اس شبہ کو بھی تفصیل کے ساتھ رفع کر دیا جائے۔

احادیث کو ناقابلِ اعتبار سمجھنے کی اصل وجہ وہم اور شک کا حد سے زیادہ بڑھ جانا ہے۔ انسان کی فطرت میں شک کا مادّہ اسلئے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ بحث و تحقیق اور تلاش و تجسس کے لئے محرک ہو، اور حقیقت کی جستجو پر انسان کو ابھارے لیکن ہر چیز کے لئے ایک حد ہوتی ہے جس سے گھٹنے یا بڑھ جانے پر وہ مستحسن نہیں رہتی۔ شک کا مادّہ اگر اتنا کم ہو جائے کہ آدمی ہر چیز کو بلا تحقیق تسلیم کرلے، تو یہ ضعیف الاعتقادی ہے جو ایک مذموم صفت ہے۔ اسی طرح شک اگر اتنا بڑھ جائے کہ تحقیق کے ان طریقوں سے جو انسان کے امکان میں ہیں اس کو مطمئن نہ ہونے دے، اور ان تمام باتوں سے انکار پر آمادہ کر دے جو تحقیق کے ایک غیر ممکن الحصول معیار پر پوری نہ اترتی ہوں، تو یہ بھی ایک مذموم صفت ہے جس کو اردو زبان میں "وہمی پن" سے تعبیر کرتے ہیں۔

غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ انسان اکثر و بیشتر معاملات میں صرف اس تحقیق پر اعتماد کرنے کے لئے مجبور ہے جس سے صرف ظنِ غالب حاصل ہوتا ہے۔ اگر وہ اس تحقیق میں شک کرے، اور علمِ یقین کے بغیر بات کو

ماننے سے انکار کردے، تو وہ دنیا کے کام کا نہ رہیگا بلکہ شاید زندہ بھی نہ رہ سکے گا۔ مثال کے طور پر میں نے آج تک کبھی کسی شخص کو سانپ کے کاٹنے سے مرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ نہ خود مجھے سانپ نے کاٹا کہ اس کے مہلک ہونے کا مجھ کو علم یقین حاصل ہوتا۔ میں نے صرف لوگوں سے یہ سنا ہے کہ جب سانپ کاٹتا ہے تو انسان مرجاتا ہے۔ میں اس روایت پر یقین رکھتا ہوں، اور سانپ کو دیکھ کر اس سے بچ جاتا ہوں۔ لیکن اگر میں اس روایت میں شک کروں، اور کہوں کہ جب تک سانپ میرے سامنے کسی کو نہ کاٹے اور اسی کی تاثیر سے وہ میرے سامنے مر نہ جائے، یا جب تک سانپ خود مجھ کو نہ کاٹے اور میں اس کے زہر سے نہ مرجاؤں، اس وقت تک میں یقین نہ کروں گا کہ سانپ مہلک ہوتا ہے، تو میرے اس شک کا جو کچھ انجام ہوگا وہ ظاہر ہے۔

یہ تو خیر روایت متواترہ کی مثال ہے جس کے مفید یقین ہونے کو عموماً تسلیم کیا جاتا ہے لیکن ہماری زندگی کے بے شمار معاملات ایسے ہیں جن میں ہم اخبار آحاد (یعنی ایک دو راویوں کی دی ہوئی خبروں) کو تسلیم کرتے ہیں، اور انہی پر اپنے فیصلوں اور اپنے علم و عمل کا مدار رکھتے ہیں۔ محض خبر ہونے کی حیثیت سے ہر خبر میں سچ اور جھوٹ ہونے کا یکساں احتمال ہوتا ہے مگر ہم ان دونوں پہلوؤں میں سے ایک کو ترجیح دینے کے لئے محض خبر کے خبر ہونے ہی پر نظر نہیں رکھتے، بلکہ عموماً خارجی قرائن سے مدد لے کر صدق یا کذب کے کسی ایک پہلو کو ترجیح دیتے ہیں، اور بسا اوقات ہماری یہ ترجیح اتنی زیادہ قوی ہوتی ہے کہ دوسرے پہلو کے امکان کو بھی تسلیم کرنے کے لئے ہم طیار نہیں ہوتے مثلاً ہر شخص کو یہ بات کہ وہ اپنے باپ کی جائز اولاد ہے، صرف اپنی ماں کی روایت سے معلوم ہوتی ہے۔ اس خبر واحد میں جس کے لئے کوئی دوسرا شاہد سرے سے مل ہی نہیں سکتا، نفس خبر ہونے کی حیثیت سے صدق و کذب کا یکساں احتمال ہے، لیکن کوئی شریف آدمی اس میں کذب کے پہلو کو ترجیح دینا تو درکنار کسی درجہ میں بھی تسلیم کرنے کے لیے طیار نہ ہوگا، خواہ واقعہ کے اعتبار سے اسکا اپنی ماں کے بیان پر یقین کرنا درست نہ ہو۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا تعلق جذبات سے ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جہاں جذبات کا دخل نہیں ہوتا وہاں بھی ہم اسی طرح اخبار آحاد کی امکانی جانچ پڑتال کر کے صدق و کذب کے دونوں پہلوؤں میں سے ایک کو ترجیح دیتے ہیں، اور اگرچہ اس ترجیح سے صرف ظن غالب حاصل ہوتا ہے، لیکن اس ظن پر ہم اسی طرح عمل کرتے ہیں جس طرح علم یقین حاصل ہونے کی صورت میں کرتے ہماری زندگی کے معاملات میں سب سے زیادہ اہم اور نازک معاملہ عدالت کا ہے جس میں جذبات کا ذرہ برابر دخل نہیں بلکہ خالص اور ٹھوس عقلی امتحان پر احکام کی بنا رکھی جاتی ہے۔ قاضی یا جج کے سامنے جتنے معاملات پیش ہوتے ہیں ان سب کا تعلق گذرے ہوئے واقعات سے ہوتا ہے اور بہت کم واقعات بلکہ شاذ و نادر ایسے ہوتے ہیں جن میں شہادتیں تواتر کی حد کو پہنچتی ہوں۔ بیشتر معاملات میں جج کے سامنے صرف "اخبار آحاد" پیش ہوتے ہیں جنہیں وہ جرح و تعدیل، قرائن و آثار اور قیاس عقلی کی کسوٹی پر کس کر سچ اور جھوٹ کے امکانی پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کو راجح قرار دیتا ہے، اور جب کوئی پہلو راجح ہو جاتا ہے، تو اس پر وہ اس طرح فیصلہ کرتا ہے، جیسے اس کے نزدیک واقعہ یقین کی حد تک ثابت ہو گیا ہے۔ اگر کوئی جج ہر شاہد کو جھوٹا اور ہر شہادت کو غلط فرض کر کے اپنا کام شروع کرے، اور ہر واقعہ کو تسلیم کرنے کے لئے اصرار کرے کہ یا تو واقعہ خود اس کی آنکھوں کے سامنے پیش آئے یا متواتر روایات اس تک پہنچیں، تو یقیناً چند ہی ساعتوں میں اس کو عدالت کی کرسی چھوڑ دینی پڑیگی۔

اسی طرح تجارت، تدبیر سلطنت اور دوسرے دنیوی کاروبار میں بھی رات دن اخبار آحاد پر بہت سے معاملات چلتے ہیں۔ بلکہ بہت سی خبریں تو ہم کو تار اور اخبارات کے ذریعہ سے ملتی ہیں جن کی صحت میں عقلاً بہت سے شکوک و شبہات کی گنجایش ہوتی ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ جس شخص نے ہم کو تار دیا ہے وہ درحقیقت وہی شخص ہے جس کا نام تار پر لکھا ہوا ہے۔ اور اگر تار فی الواقع اسی کا دیا ہوا ہے تب بھی ہم کو نہیں معلوم کہ جو خبر وہ دے رہا ہے وہ اسے کس ذریعے سے معلوم ہوئی؟ اور اس کا ذریعہ معتبر ہے یا نہیں؟ اس قسم کے بہت سے احتمالات ہر تار کی خبر میں ہوتے ہیں، لیکن جن لوگوں کا سارا کاروبار انہی خبروں پر چلتا ہے

وہ ان احتمالات کی طرف بہت کم توجہ کرتے ہیں محض ظاہری قرائن سے یہ جانچ لیتے ہیں کہ تار انہی کے ایجنٹ کا دیا ہوا ہے، یا نہیں، اور جب ایک ظن غالب ان کو حاصل ہو جاتا ہے، تو اس پر اپنے لاکھوں روپے لگا دیتے ہیں۔

یہی صورت مذہبی معاملات میں بھی ہے۔ سب سے بڑی چیز جس پر ہمارے ایمان کا مدار ہے، قرآن مجید ہے۔ اس کتاب کا کلام الٰہی ہونا ہم کو صرف ایک گواہ کی شہادت سے معلوم ہوا ہے، اور وہ گواہ ذات رسالت پناہ ہے نفس خبر ہونے کے لحاظ سے اس میں بھی صدق و کذب کا احتمال ہے لیکن خبر جس گواہ نے دی ہے اس کی راست بازی، دیانت، پاکیزہ سیرت کو دیکھ کر، اور جو خبر اس نے دی ہے اس کی معقولیت اور حقانیت کا لحاظ کر کے ہم کذب کے پہلو پر صدق کے پہلو کو راجح قرار دیتے ہیں، اور پھر یہی ترجیح ایمان بن کر ہمارے قلب میں ایسی راسخ ہو جاتی ہے کہ کذب کا تصور بھی آنے نہیں پاتا لیکن دوسری طرف بہت سے لوگ ہیں جنہیں اس شاہد امین کی شہادت میں شک ہے، اور اسی شک کی بنا پر وہ اس کی تصدیق سے انکار کر دیتے ہیں۔ ہم میں اور ان میں اگر کوئی فرق ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ ہم نے ایک راست باز گواہ کی گواہی کو تسلیم کیا اور مسلمان ہو گئے، انہوں نے اس کی گواہی میں شک کیا اور کفر میں مبتلا ہو گئے۔ ورنہ یہ ظاہر ہے کہ وحی اترتے ہوئے نہ ہم نے دیکھی اور نہ انہوں نے۔

ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو گئی کہ بالعموم اوسط درجے کے انسان اپنی زندگی کے معاملات میں نہ اتنے ضعیف الاعتقاد ہوتے ہیں کہ ہر خبر کو بلا تحقیق و تفتیش قبول کریں اور نہ اتنے شکی اور وہمی ہوتے ہیں کہ ہر خبر کی صحت اور ہر راوی کی صداقت میں شبہ کریں، اور ہر معاملہ میں رائے قائم کرنے کے لئے اس علم یقین کا مطالبہ کریں جو صرف تجربہ و مشاہدہ یا روایت متواترہ سے حاصل ہوتا ہے۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان عقل سلیم اور معتدل فطرت رکھنے والے انسانوں کا طرز عمل یہ ہوتا ہے کہ وہ خبروں اور روایتوں کو امکانی ذرائع تحقیق سے کام لے کر جانچتے ہیں، اور اس جانچ پڑتال میں اگر ان کے غلط

ہونے کا گمان غالب (نہ کہ یقین) ہوتا ہے تو انہیں رد کر دیتے ہیں، اور اگر ان کے صحیح ہونے کا گمان غالب (نہ کہ یقین) حاصل ہو جاتا ہے تو ان کو قبول کر کے انہی کے مطابق عمل کرتے ہیں تحقیق اور جانچ پڑتال کا معیار بھی تمام خبروں کے لئے یکساں نہیں ہوتا بلکہ اس کے سخت اور نرم ہونے کا انحصار خبر کی نوعیت اور اس معاملہ کی اہمیت پر ہوتا ہے جس سے اس خبر کا تعلق ہے۔

یہ تو اس مسئلہ کی عملی حیثیت تھی اب اگر آپ عقلی حیثیت سے بھی غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہی اعتدال کا طریقہ عین مطابق عقل ہے، اور اس کے خلاف ضعیف الاعتقادی اور وہمی پن دونوں خلاف عقل ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ عقل کے نزدیک ہر واقعہ میں شک کرنا ممکن ہے، حتیٰ کہ محسوسات اور مشاہدات تک میں بھی شک کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ لازم نہیں کہ ہر وہ فعل جو کیا جا سکتا ہو، اس کا کرنا عقل کے نزدیک درست اور احسن بھی ہو۔ مزید برآں عقل ہر خبر کے متعلق صرف یہ حکم لگاتی ہے کہ اس میں صدق اور کذب کا یکساں احتمال ہے یعنی محض خبر ہونے کی حیثیت سے وہ سچ اور جھوٹ ہونے کا مساوی امکان رکھتی ہے، اور جب تک کوئی معقول وجہ کسی ایک پہلو کو ترجیح دینے کے لئے موجود نہ ہو کسی خبر کو نہ سچ کہا جا سکتا ہے اور نہ جھوٹ۔ لیکن کوئی خبر ہم کو محض خبر ہونے کی حیثیت سے نہیں پہنچتی، بلکہ اس کے ساتھ لازماً بہت سے ایسے قرائن بھی ہوتے ہیں جن سے تصدیق یا تکذیب کی جانب پلڑا ضرور جھکتا ہے۔ خالص شک کا مقام یعنی جہاں نہ تصدیق ہو اور نہ تکذیب، ایک ایسا باریک مقام ہے کہ انسان کا ذہن چند لمحے بھی اس پر نہیں ٹھیر سکتا، اس لئے ہر خبر کو سنتے ہی ذہن فوراً ایسے وجوہ تلاش کرنے لگتا ہے جن سے مدد لے کر وہ شک کے مقام سے تصدیق یا تکذیب کی طرف جائے، اور یہ بات بالکل ذہن کے سلیم یا مریض ہونے پر موقوف ہے کہ وہ ان دونوں پہلوؤں میں سے کسی پہلو کو معقول وجوہ کے ساتھ ترجیح دیتا ہے یا غیر معقول وجوہ کے ساتھ۔ کسی خبر کا متواتر نہ ہونا، یا خبر واحد ہونا عقلاً اس کے لئے ہرگز کافی نہیں ہے کہ اس کے غلط ہونے کا حکم لگا دیا جائے۔ نہ یہ بات کسی خبر کو جھوٹ قرار دینے کے لئے کافی اور معقول وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ بہت قدیم زمانہ سے متعلق ہے اور

ہم تک بہت سے واسطوں سے پہنچی ہے۔ نہ کوئی صاحب عقل آدمی یہ فرض کرسکتا ہے کہ ہر مخبر جھوٹا ہوتا ہے اور دنیا کے تمام مخبر آپس میں متفق ہوکر جھوٹی خبریں دینے کا فیصلہ کرچکے ہیں۔ اس قسم کے تمام مفروضات جو تکذیبی ذہنیت رکھنے والوں کے دل و دماغ پر مسلط ہوجاتے ہیں، اور جن کی بنا پر وہ ہر خبر کی تکذیب کی طرف مائل ہوجایا کرتے ہیں، قطعاً خلاف عقل ہیں، اور اسی طرح اس کے برعکس جن مفروضات کی بنا پر ہر خبر اور ہر مخبر کی تصدیق کی جاتی ہے، وہ بھی عقل کے مطابق نہیں ہیں۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان صحیح راستہ جو ایک سلیم الفطرت ذہن اختیار کرے گا وہ یہی ہے کہ وہ مجموعاً تمام خبروں کی نہ تصدیق کرے گا اور نہ تکذیب۔ بلکہ ہر خبر کو فرداً فرداً لے کر اس کے مخصوص حالات کے لحاظ سے تحقیق و تفتیش کے ایک خاص معیار پر جانچے گا اور جب اس تحقیق کے ذریعہ سے صدق و کذب کے دونوں پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کی طرف گمان غالب حاصل ہوجائے گا تو وہ اسی پہلو کا حکم لگادیگا۔

اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ کسی خبر کی تحقیق کا سخت سے سخت قابل عمل معیار کیا ہوسکتا ہے؟ فرض کیجئے کہ ایک شخص زید اب سے سو برس پہلے گذرا ہے، جس کے متعلق عمرو ایک روایت آپ تک پہنچاتا ہے۔ آپ کو تحقیق کرنا ہے کہ زید کے متعلق یہ روایت درست ہے یا نہیں؟ اس غرض کے لئے آپ حسب ذیل تنقیحات قائم کرسکتے ہیں:۔

۱۔ یہ روایت عمرو تک کس طریقے سے پہنچی؟ درمیان میں جو واسطے ہیں ان کا سلسلہ زید تک پہنچتا ہے یا نہیں؟ درمیانی راویوں میں سے ہر راوی نے جس شخص سے روایت کی ہے اس سے وہ ملا بھی تھا یا نہیں؟ ہر راوی نے روایت کس عمر اور کس حالت میں سنی؟ روایت کو اس نے لفظ بلفظ نقل کیا یا اس کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں ادا کیا؟

۲۔ کیا یہی روایت دوسرے طریقوں سے بھی منقول ہے؟ اگر منقول ہے تو سب بیانات متفق ہیں یا مختلف؟ اور اختلاف ہے تو کس حد تک؟ اگر کھلا ہوا اختلاف ہے تو مختلف طریقوں میں سے کونسا

طریق روایت زیادہ معتبر ہے ؟

۳۔ جن لوگوں کے واسطے سے یہ خبر پہنچی ہے وہ خود کیسے ہیں، جھوٹے یا بد دیانت تو نہیں ؟ اس روایت میں ان کی کوئی غرض تو مخفی نہیں ؟ ان میں صحیح یاد رکھنے اور صحیح نقل کرنے کی قابلیت تھی یا نہیں ؟

۴۔ زید کی افتاد طبع اس کی سیرت اس کے خیالات اور اُس کے احوال کے متعلق جو مشہور و متواتر روایات یا ثابت شدہ معلومات ہمارے پاس موجود ہیں، یہ روایت ان کے خلاف تو نہیں ہے۔

۵۔ روایت کسی غیر معمولی اور بعید از قیاس امر کے متعلق ہے یا معمولی اور قرین قیاس امر کے متعلق ؟ اگر پہلی صورت ہے تو کیا طُرقِ روایت اتنے کثیر، مسلسل اور معتبر ہیں کہ ایسے امر کو تسلیم کیا جا سکے؟ اور اگر دوسری صورت ہے تو کیا روایت اپنی موجودہ شکل میں اس امر کی صحت کا اطمینان کرنے کے لئے کافی ہے ؟

یہی پانچ پہلو ہیں جن سے کسی خبر کی جانچ پڑتال کی جا سکتی ہے۔ ان سوالات کے متعلق اگر ذرائع تحقیق ہمارے پاس موجود ہوں، اور ان ذرائع سے کوئی خبر تحقیق کے معیار پر پوری اتر جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کی تکذیب کریں۔ اور اگر کوئی خبر اس معیار پر پوری نہ اترے تو ہم کو حق ہے کہ خواہ اس کی تکذیب کریں، یا اس کو رد کر دیں۔ لیکن اگر ذرائع تحقیق موجود ہوتے ہوئے بھی کوئی شخص فرداً فرداً ہر خبر کو جانچنے اور اس کے متعلق رائے قائم کرنے کے بجائے تمام خبروں کو مجموعاً محض اس بنا پر رد کر دے یا جھوٹ قرار دے کہ ان میں بعض جعلی خبریں ملی ہوئی ہیں، یا بعض راویوں کی کمزوریاں ثابت ہیں، یا بعض خبریں اس شخص کی عقل میں نہیں سماتیں، تو اس سے بڑھ کر غیر معقول طرز عمل اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

اس تمہیدی بیان نے معاملہ کو بالکل صاف کر دیا ہے۔ اگر کوئی شخص ذات رسالت پناہ کے اسوۂ حسنہ اور سنت مطہرہ سے کوئی تعلق رکھنا ہی نہ چاہتا ہو، تو یہ ایک دوسری بات ہے لیکن اگر وہ آنحضرت کی تقلید فرض سمجھتا ہے، اور اسے یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ حضورؐ نے اپنی ۲۳ سال کی حیات نبوی میں

کس طرح زندگی بسر کی؟ کونسے افعال کئے؟ کن افعال سے اجتناب کیا؟ کن باتوں کو جائز رکھا؟ کن باتوں سے منع فرمایا؟ تو لامحالہ اس کو حدیث کے ذخیرہ کی طرف توجہ کرنی پڑے گی۔ یہاں وہ دیکھے گا کہ اس وقت بھی دنیا میں کم و بیش چار پانچ لاکھ آدمی ایسے موجود ہیں جن کے پاس حدیث کی کتابیں امام مالک، امام محمد، امام شافعی، امام احمد ابن حنبل، امام بخاری، اور دوسرے ائمہ حدیث سے سلسلہ بسلسلہ پہنچی ہیں، اس لئے اس امر میں کسی شبہ کی گنجایش نہیں کہ یہ کتابیں انہی بزرگوں کی لکھی ہوی ہیں۔ پھر اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ ان بزرگوں نے ہر حدیث کی جو سند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابۂ کرام تک پہنچائی ہے، وہ کم از کم ان کی تحقیق کے لحاظ سے درست تھی۔ لہذا ان کتابوں کے ذریعہ سے حدیث کا وہ علم قریب قریب یقینی طور پر ہم تک پہنچ گیا ہے جو پہلی دوسری تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے ائمۂ حدیث کے پاس تھا۔ اس کے علاوہ احادیث کے متعلق وہ تمام معلومات بھی معتبر کتابوں کے ذریعہ سے ہم تک پہنچ گئی ہیں جن سے کام لے کر محدثین نے حدیثوں اور ان کے راویوں کے حالات کی جانچ پڑتال کی ہے۔ اور پھر ہم نے ایک خبر کی تحقیق کے لئے جو تنقیحی سوالات قائم کئے ہیں ان میں سے ہر سوال کا مفصل جواب قریب قریب ہر حدیث کے متعلق ہم کو ان کتابوں میں مل جاتا ہے، اور محدثین کے درمیان احادیث، اور ان کی تحقیق کے بارے میں جو اختلافات آرا رہے ہیں وہ بھی تمام دلایل، اور وجوہ کے ساتھ محفوظ ہیں۔ اس وسیع، مفصل، اور زیادہ سے زیادہ امکانی وثوق رکھنے والے ذخیرہ کے موجود ہوتے ہوے، کوئی صاحب عقل انسان یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا کوئی واقعہ اور آنحضرت کا کوئی ارشاد آج دنیا میں صحت کے ساتھ موجود نہیں ہے۔ ایسا دعویٰ کرنے والے کو سب سے پہلے ثابت کرنا پڑیگا کہ عہد رسالت سے لیکر ہمارے زمانہ تک جو لاکھوں سے متجاوز اور کروڑوں تک پہنچے ہوے مسلمان احادیث نبوی کے نقل کرنے اور سننے سنانے میں مشغول رہے ہیں، وہ سب کے سب یا ان میں سے اکثر جھوٹے تھے، اور انہوں نے بالاتفاق یہ طے کر لیا تھا کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تہمت گھڑنے اور اس طریقے سے مسلمانوں کو گمراہ کرنے اور اسلام کو تباہ و برباد کرنے ہی میں اپنی ساری عمر بسر کرینگے۔ اگر کوئی منکر حدیث اس امر کا ثبوت رکھتا ہے تو وہ اس کو پیش کرے ہم اسے یقین دلاتے ہیں کہ ساری دنیا کے محققین اور مستشرقین کے کارنامے اسکی اس نادر تحقیق کے سامنے دب جائینگے لیکن اگر اس کے پاس بدگمانی اور جھوٹے الزامات، اور کل پر بعض کا حکم لگانے کے مغالطہ انگیز اور خلاف عقل و دیانت طریقوں کے سوا اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کو وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کر سکتا ہو تو اسے کم از کم یہ امید نہ رکھنی چاہئے کہ جن لوگوں کی عقل درست ہے اور جو فطرت سلیمہ سے بہرہ ور ہیں وہ بھی اس کے دعوے کو تسلیم کرکے حدیث کی ساری خبروں کو مجموعی حیثیت سے غلط اور قابل رد قرار دیدیں گے۔

ہم نے کبھی اس خیال کی تائید نہیں کی کہ ہر شخص کو ائمہ حدیث کی اندھی تقلید کرنی چاہئے یا ان کو غلطی سے مبرا سمجھنا چاہئے۔ نہ کبھی ہم نے یہ دعویٰ کیا کہ ہر کتاب میں جو روایت قال رسول اللہ سے شروع ہو اس کو آنکھیں بند کرکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مان لیا جائے۔ برعکس اس کے ہمارے نزدیک کسی حدیث کو حدیث رسول قرار دینے کی ذمہ داری ایک گراں بار ذمہ داری ہے جس کو اٹھانے کی جرأت کافی تحقیق کے بغیر ہرگز نہ کرنی چاہئے۔ اور تحقیق و اجتہاد کے متعلق بھی ہمارا مذہب یہ ہے کہ اس کا دروازہ ہر زمانہ میں کھلا ہوا ہے، اور کسی خاص عہد کے لئے مخصوص نہیں ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جن لوگوں نے فن حدیث کی تحصیل اور اس کے باقاعدہ مطالعہ اور تحقیقات میں پورا ایک مہینہ بھی صرف نہیں کیا ہے وہ ان بزرگوں کے کارناموں پر تنقید کریں جنہوں نے پوری پوری عمریں اس فن کی خدمت میں بسر کی ہیں۔ صرف ایک فن حدیث ہی پر موقوف نہیں ہے۔ دنیا کا کوئی علم و فن بھی آپ کو ایسا نہ ملے گا جس میں ہتدیوں اور اناڑیوں کو ریسرچ اور ماہرانہ اظہار رائے، اور مجتہدانہ کلام کا حق دیا جاتا ہو۔ یہ حق انسان کو صرف اس وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ فن کے مبادی اور اصول پر پوری طرح حاوی ہو چکا ہو، اور جتنا ذخیرہ معلومات اس فن کے متعلق موجود ہو، وہ سب اس کی نظر میں ہو۔ باقی رہا وہ شخص جو ابھی اس مرتبہ کو نہیں پہونچا ہے

تواس کے لئے سلامتی اسی میں ہے کہ وہ ائمہ فن کی تحقیقات اور ان کی آرار کا اتباع کرے۔ تمام دنیوی علوم کی طرح مذہبی علوم میں بھی یہی طریقہ بہتر اور صحیح تر ہے۔ اس کو چھوڑ کر جو لوگ اجتہاد بلا علم کا علم بلند کرتے ہیں۔ وہ دنیا اور دین دونوں میں اپنے لئے رسوائی کا سامان کرتے ہیں۔

نوٹ :- اس مضمون کی پہلی قسط شائع ہونے کے بعد جناب ایڈیٹر صاحب رسالہ "بلاغ" نے میرے پاس مولانا احمدالدین صاحب امرتسری کی کتاب "برہان القرآن" بھیجی اور اس کے ساتھ اپنے عنایت نامے میں مجھ سے خواہش فرمائی کہ اس مضمون کو لکھتے وقت کتاب مذکور کو بھی پیش نظر رکھوں نیز انہوں نے مجھ کو یقین دلایا کہ اگر محققانہ طرز میں حقیقت حدیث کے چہرے سے نقاب اٹھا دیا گیا تو ان کی جماعت قبول حق میں تامل نہ کرے گی۔ میں اس عنایت نامے کیلئے موصوف کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اور ان کی حق پسندی پر انہیں مبارکباد دیتا ہوں۔ میں برہان القرآن کا مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ وہ ایک علیحدہ تنقید کی محتاج ہے، اور اس مضمون میں اس پر بحث کرنا خلط مبحث کا موجب ہوگا۔ اس لئے انشاءاللہ عنقریب اس پر مفصل تبصرہ کروں گا۔ خدا مجھ کو احقاق حق کی توفیق عطا فرمائے اور کجروی و گمراہی سے محفوظ رکھے۔

اسٹیشنری

کیا آپ جانتے ہیں کہ حیدرآباد میں بہترین اسٹیشنری کہاں مل سکتی ہے؟
دیکھئے پتھر گٹی روڈ پر **فدا علی محمد علی جنرل پیپر اینڈ اسٹیشنری مرچنٹ**
کی دوکان جہاں تمام قسم کے فونٹن پن اور کاغذات کے علاوہ اسٹیشنری کا سامان کفایت سے اور نہایت عمدہ مل سکتا ہے۔ ضرورت کے وقت ٹیلیفون سے بھی دریافت کرسکتے ہیں۔ (فون ۵۶۵)